اکائی 17 ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی اور متن کی تدریس و تفہیم

ساخت

17.1 اغراض ومقاصد
17.2 تمہید
17.3 ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی اور متن کی تدریس وتفہیم
17.3.1 ناصؔر کاظمی: حیات وخدمات
17.3.2 ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی
17.3.3 متن کی تدریس وتفہیم
(الف) کچھ یادگارشہر ستم گر ہی لے چلیں
(ب) یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئی
17.4 آپ نے کیا سیکھا؟
17.5 اپنا امتحان خود لیجیے
17.6 سوالوں کے جوابات
17.7 فرہنگ
17.8 کتب برائے مطالعہ

17.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- ناصؔر کاظمی کے سوانحی کوائف اور ان کی خدمات سے واقف ہوں گے۔
- ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی سے روشناس ہوں گے۔
- ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی کی انفرادیت سے متعارف ہوں گے۔
- ناصؔر کاظمی کی شامل نصاب دوغزلوں کی قرأت کریں گے۔
- ناصؔر کاظمی کی شامل نصاب غزلوں کی تشریحات سمجھیں گے۔

17.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ تیسرے بلاک کے تحت آپ نے مختلف فکر وذہن کے نمائندہ شعرا مثلاً یگانؔہ، جگؔر، فراؔق، فیضؔ، جذؔبی، مجروؔح اور کلیم عاجؔز کی غزل گوئی کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اب آپ چوتھے بلاک کے ضمن میں جدیدیت کی تحریک سے متاثر شعرا جیسے ناصؔر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، احمد فرازؔ، مخمور ابانیؔ، شہریاؔر اور پروینؔ شاکر وغیرہ کی غزل گوئی کا مطالعہ کر کے ان کی خصوصیت وانفرادیت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس اکائی

میں آپ ثانیؔ میرؔ ناصرؔ کاظمی کی حیات و خدمات کو جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی غزل گوئی کا مفصل مطالعہ کریں گے۔اس کے علاوہ نصاب میں شامل ان کی دو غزلوں کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح و توضیح سے بھی آپ مستفید ہوں گے۔

17.3.1 ناصرؔ کاظمی: حیات و خدمات

ناصرؔ کاظمی کا پورا نام سید ناصر رضا کاظمی تھا۔انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں آنکھیں کھولیں۔ان کی پیدائش ۸؍دسمبر ۱۹۲۵ء کو محلّہ قاضی واڑہ، انبالہ (پنجاب) میں ہوئی۔ان کی والدہ کا نام کنیزہ محمد بیگم اور والد کا نام سید محمد سلطان کاظمی تھا۔ چوں کہ ان کا شجرۂ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؓ سے ملتا ہے اسی لیے کاظمی کہلاتے ہیں۔ناصر کے والد فوج میں صوبے دار میجر تھے۔ناصر نے پانچویں جماعت تک انبالہ کے 'مشن گرلز اسکول' میں تعلیم حاصل کی، جہاں ان کی والدہ معلّمہ تھیں۔ چند جماعتیں پشاور میں پڑھیں۔پھر انبالہ کے مسلم ہائی اسکول سے نویں اور دسویں کا امتحان پاس کیا۔انبالہ کے بعد انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا، لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے بی اے کی ڈگری مکمل نہیں کرسکے۔جس زمانے میں وہ بی۔اے کر رہے تھے تقسیم ہند کا سانحہ رونما ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔اس وقت ناصر کی عمر ۲۲ برس کی تھی۔ملک کی تقسیم اور ستم بالائے ستم ہجرت کا واقعہ ناصر کاظمی کی زندگی کا سب سے بڑا اور حیات شکن واقعہ ہے۔خیر پاکستان بننے کے بعد آگ اور خون کا دریا پار کر کے وہ لاہور پہنچے۔لیکن انبالہ کی رونقوں اور پھر اس کی ویرانی کی گرانی ناصر کے دل سے کبھی نہیں گئی۔شہر کے اجڑنے اور بسنے کی کہانی میرؔ یا عہد میر کے دوسرے شعرا کی طرح ناصر کاظمی نے بھی غزل کے اشعار میں بیان کی ہے۔

لاہور آنے کے بعد ابتدا میں ایک عالی شان کوٹھی میں سکونت پذیر رہے، لیکن والد کے ریٹائرمنٹ کے بعد یہ کوٹھی خالی کرنی پڑی۔اس کوٹھی کے بعد لاہور کے ایک محلّہ پرانی انار کلی میں منتقل ہوئے، جہاں انھیں رہنے کے لیے ایک مکان مل گیا۔ چوں کہ والد ریٹائر ہو چکے تھے اور جلد ہی انتقال بھی کر گئے اس لیے ناصر کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔مالی دشواریوں کے تدارک کے لیے والدہ کے زیورات بیچ بیچ کر گزارہ کرنے لگے۔ان کی والدہ ناصر کاظمی کی بے کاری اور کوچہ گردی سے دل برداشتہ تھیں۔ بیٹے کے مستقبل کی فکر میں ایک دن وہ اس دنیا سے چل بسیں۔ناصر کاظمی کی خالہ اصغری بی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی ناصر کی طبیعت میں ایک قسم کا لاابالی پن تھا۔ پڑھائی میں ان کا دل کچھ خاص نہیں لگتا تھا۔اس سے زیادہ وہ گھڑ سواری، شکار کھیلنے، گاؤں قریوں میں پھرنے، دریاؤں اور پہاڑوں کی سیر کرنے میں دلچسپی لیتے تھے۔چوں کہ طبعاً ذہین تھے اس لیے لاابالی پن کے باوجود اپنی جماعت میں اول آتے۔

والدہ کے انتقال کے بعد ناصر نے معاشی تنگی کے ازالے کے لیے صحافت کو بطور پیشہ اپنایا۔۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ ''اوراق نو'' کے مدیر رہے۔۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ ''ہمایوں'' کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔رسالہ ''ہم لوگ'' کے نائب مدیر بھی رہے۔۱۹۵۷ء میں انھوں نے رسالہ ''خیال'' جاری کیا جو چند عرصے کے بعد بند ہو گیا۔۱۹۶۴ء میں وہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے اور اخیر تک اسی سے وابستہ رہے۔

غزل گوئی میں حفیظ ہوشیار پوری ان کے استاد تھے۔ناصر کاظمی کا سب سے پہلا شعری مجموعہ ''برگ نے'' جو غزلوں پر مشتمل ہے، ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آیا۔علاوہ ازیں دیوان (غزلیں، ۱۹۷۲ء)، پہلی بارش (غزلیں،

۱۹۷۵ء)، نشاطِ خواب (نظمیں، ۱۹۷۷ء)، سر کی چھایا (منظوم ڈراما، ۱۹۸۱ء) اور خشک چشمے کے کنارے (نثر ۱۹۸۲ء) ناصر کاظمی کی قابلِ ذکر تخلیقات ہیں۔ ۲/مارچ ۱۹۷۲ء کو ۴۶ سال کی عمر میں ناصر کاظمی کا انتقال ہو گیا۔

17.3.2 ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی

تقسیم ہند کے بعد اردو کے جن غزل گو شاعروں نے دنیائے غزل میں اپنا سکہ جمایا، ان میں ناصر کاظمی کا نام نمایاں ہے۔ بچپن میں گھڑ سواری، شکار کرنا، ندی کے کنارے گھومنا، پہاڑوں کے نظارے کرنا، شطرنج کھیلنا، چڑیوں سے پیار کرنا، پودوں سے دلار کرنا، ناصر کاظمی کے پسندیدہ شوق تھے۔لیکن تقسیم ہند کے بعد جس طرح کے حالات پیدا ہوئے ان میں وہ اپنے مذکورہ مشغلوں سے محروم ہو گئے۔ناصر کاظمی جدید غزل کے معماروں میں سے ہیں۔انھوں نے چند مضامین بھی لکھے اور کچھ نظمیں بھی لکھیں، لیکن اُن کی بنیادی پہچان ایک غزل گو کے طور پر ہے۔انھوں نے غزل گوئی کو اپنے تخلیقی اظہار کا خاص میدان بنایا۔

ناصر کاظمی کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں تو چند الفاظ ایسے ہیں جن سے قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ یہ الفاظ ناصر کاظمی کی شاعری کا محور تھے۔مثال کے طور پر خواب، ساقی، طاؤس، رُت، رات، غبار، سفر، گرد، قافلے، پھول، کانٹا، اجاڑ، اداس، بیگانگی، تھکاوٹ، نیند، رفتگاں، منزل کا سراغ، یاد، شہر، نگر، چہرہ، دھوپ، کھڑکی، بستی، مٹی، پیاس، تھکن اور جنگل وغیرہ۔اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ناصر کاظمی کے پاس ڈکشن کی کمی تھی بلکہ ناصر کا یہ ڈکشن محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ان کے اشعار کے مضامین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔گویا ناصر لفظوں کو مخصوص تناظر میں استعمال کر کے نئی طرح کے مضامین کی بنا ڈالتے ہیں، جن کا عصری حسیت سے گہرا تعلق ہے۔ناصر نے ایسا رمزیہ اظہار بیان اختیار کیا کہ ان کے عہد کی حسیت ایک تسلسل کی حامل ہو گئی اور آج کے عہد کا المیہ بھی اسی طرح ناصر کے عہد سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، جس طرح ناصر کے عہد کا المیہ عہد میر کا ہم رنگ تھا۔ وہی سلگتے مکان، جلتے، بھنتے اور اجڑتے شہر، لٹتی عصمتیں اور سڑتی گلتی لاشیں، نقل مکانی، نئے کوچے کی اجنبی فضائیں اور اس اجنبیت سے پیدا شدہ تنہائی اور اداسی جو میرؔ کے عہد سے ناصر کے عہد میں منتقل ہوئیں۔عذابوں کی یہ نقل مکانی نئے اسباب کے سبب ہنوز جاری ہے۔ یوں بھی ناصر کاظمی کے نزدیک تاریخ مختلف زمانوں کا الگ الگ قصہ نہیں بلکہ ایک مسلسل تجربہ تھی۔ ناصر کاظمی کے شعری مزاج کی تشکیل یادوں کے اندوہ، طرب ونشاط اور احساس سے ہوتی ہے۔ بے وطنی، ہجرت، رات اور شہر کے استعارے یادوں کے مذکورہ مختلف النوع رنگوں کو چمکاتے ہیں مثلاً:

آج کی رات نہ سونا یارو
آج ہم ساتواں در کھولیں گے

ناصر کاظمی کی غزلوں میں حزن وملال کی خاص لے پائی جاتی ہے جو رومانی خوشیوں سے معمور ہے۔ان کی شاعری میں سرخوشی کا سرگم اور افسردگی کی لے دونوں خصوصیات اس طور پر پائی جاتی ہیں کہ وہ ہر قسم کے پروپیگنڈے سے ماورا ہیں۔اسی بنا پر عشق اور محبت کی مختلف کیفیات کا بیان ان کی غزلوں کا امتیازی وصف ہے۔مثال کے طور پر ذیل میں درج دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

ناصر کاظمی کے یہاں کیفیت کا معاملہ اتنا کثیر اور اس قدر شدید ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس معاملے میں اشعار ناصر کو طرز میر کا سچا ''تخلیقی اتباع'' قرار دیا ہے۔ میر کی شاعری کے فکری، تہذیبی اور نفسیاتی تجربے اور ناصر کاظمی نیز ہمارے عہد کے بعض ذہنی، جذباتی اور تہذیبی محرکات میں اشتراک کے بہت سے پہلو ہیں۔ ناصر کاظمی نے اپنی غزلوں میں بیشتر انھی مشترکہ پہلوؤں سے سروکار رکھا ہے جس کی وجہ سے ان پر تقلید میر کا گمان ہوتا ہے۔ خود ناصر کاظمی کے بیانات نے اس گمان کو جلا بخشی۔ انھوں نے اپنی غزل گوئی کے لیے کلام میرؔ کو بنیادی سرچشمے کی حیثیت سے قبول کیا۔ میر کی شاعری پر ناصر نے ایک مضمون بھی لکھا، جس میں انھوں نے میر کے عہد کو ایک رات سے تعبیر کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میر کے عہد کی رات ہمارے اپنے عہد کی رات سے آملی ہے۔ اسی بنا پر ناصر کی پیروی میر کو مضامین یا حزنیہ جذبات کے اظہار میں محدود کر دیا گیا۔ حالاں کہ میر کی شاعری محض درد و غم کی شاعری ہے یا المیہ اور حزنیہ جذبات کلام میر کا غالب حصہ ہیں، مطالعۂ میر کی کثرت بالخصوص ''شعر شور انگیز'' کی اشاعت کے بعد یہ بات قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ میرؔ سے تخلیقی استفادے کا دعویٰ کرنے والے لوگ یا جن کے کلام پر پیروی میر کا گمان کیا گیا ناصر کے علاوہ بھی تھے لیکن سچا ''تخلیقی اتباع'' صرف ناصر کاظمی سے ہو سکا۔ یہ سچا ''تخلیقی اتباع'' دراصل میر کے خاص اسلوب ''کیفیت'' کو اپنانے اور اس روایت کی پاس داری کرنے سے پیدا ہوا، جس کے پاس دار خود میر بھی تھے۔ غزل کی اور میر کی روایت ایک دریا کی طرح ہے لیکن ناصر کاظمی اس دریا میں بہنے کے بجائے اس کے بہاؤ سے بچنے کے لیے اپنی ناؤ بھی رکھتے تھے۔ شور انگیزی کا تعلق جہاں شعر کے متکلم سے ہے وہیں کیفیت والے اشعار سامع یا قاری کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ کیفیت کو چابک دستی اور فنی ہنر مندی کے ساتھ برتنے کی وجہ سے ناصر کاظمی کی غزلیں اور غزلوں کے اشعار آج بھی قاری یا سامع کے ذہن و دل کو اس حال تک پہنچا دیتے ہیں کہ وہ غور و فکر کے بجائے شعر سے ہویدا کیفیت میں ڈوبا رہنا چاہتا ہے۔ اسی اسلوب بیان کی وجہ سے ناصر کو احساسات، محسوسات یا حسیت کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنے مخصوص مضامین کو کیفیت کے اسلوب میں بیان کر کے قاری یا سامع کو اپنے مدار میں لے لیا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
یوں ہی پھرتے رہو اداس اداس

اندھیری شام کے پردے میں چھپ کر
کسے روتی ہے چشمے کی روانی

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

یہاں جنگل تھا آبادی کے پہلے
سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی

ناصر کاظمی کی غزلوں میں زبان اور الفاظ کے استعمال کی برجستگی خاص طور پر متوجہ کرتی ہے۔ شعر خواہ کتنا ہی نزولی صفت معلوم ہو، لیکن اس میں شعوری کوشش کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ ناصر کاظمی بھی شعر سے ''زور آزمائی'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی شعوری کوشش سے ماورا نہیں۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں کسی قسم کے تکلف یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ زبان اور اس کے استعمال پر ناصر کاظمی کی قدرت اور سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے وہ اشعار جو فارسی تراکیب سے آمیز ہیں ان میں بھی تکلف اور تصنع کی جگہ ایسی برجستگی نظر آتی ہے جس سے فارسی تراکیب کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ان کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں پہلا شعر فارسی ترکیب سے عاری ہے اور دوسرا شعر فارسی ترکیب سے مملو:

رین اندھیری ہے اور کنارا دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

ابھی وہ دشت منتظر ہیں مرے
جن پہ تحریر پائے ناقہ نہیں

ناصر کاظمی کا انداز بظاہر صاف اور واضح معلوم ہوتا ہے، لیکن صفائی اور وضاحت بیان ایک سراب کی طرح ہے۔ ناصر کاظمی کے کلام میں ایسی وضاحت اور صفائی کا گزر نہیں جس سے شاعری مجروح ہوتی ہو۔ وہ ابہام سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ بلکہ سادہ سے سادہ اور سہل ممتنع کے حامل اشعار میں بھی وہ الفاظ کے معنی ومفہوم کے نادیدہ امکانات کو جگاتے ہیں۔ یعنی ان کے کلام میں جو روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ نظر آتے ہیں وہ عام بول چال سے زیادہ پُرقوت اور ماورائیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں درج ان کا مشہور شعر ملاحظہ کیجیے:

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی

تخلیقی زبان بالخصوص شعری زبان میں تشبیہ، استعارہ، علامت اور پیکر کی اہمیت حد درجہ ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ صنائع بدائع، علامت، پیکر اور الفاظ کی مخصوص ترتیب وتنظیم کے بغیر تخلیقی زبان کا وجود ممکن ہی نہیں۔ تخلیقی زبان میں تشبیہ، استعارہ، علامت اور پیکر ہر ایک کا اپنا کردار اور معنویت ہے۔ ناصر کاظمی کی غزلوں میں پیکر تراشی کا عمل بھی خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔ ان کے پیکر داخلی کیفیت، تصور، خیال اور حالت کی تجسیم کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت قوت باصرہ، سامعہ، شامہ اور لامسہ کو متحرک کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی دھیان رہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر کیفیت پیدا کرنے کا ایک آلہ ہے۔ یعنی ان کے پیکر والے اشعار میں کیفیت کا حسن عموماً نظر آتا ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بصری، سمعی، شامی اور لمسی یا ذہنی کیفیت کو متحرک کرنے میں پیکروں کا نمایاں رول ہے:

دھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے
تیرے بالوں کو چوما تھا

پھر چمکنے لگیں سونی راہیں
ساربانوں کی صدا پھر آئی

17.3.3 متن کی تدریس و تفہیم

عزیز طلبا! آیئے اب ہم ناصر کاظمی کی شامل نصاب پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(الف)

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

عزیز طلبا! ابھی ہم نے مذکورہ جس غزل کو پڑھا ہے اس کی تشریح و توضیح مندرج ذیل ہے:

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

معشوق کو اس کی بے اعتنائی، تغافل، بے مروتی اور جفا شعاری کی وجہ سے ستم گر کہنے کی روایت ہے۔ ظاہر ہے معشوق کی یہ صفات عاشق کے لیے کسی ستم سے کم نہیں۔ اب جب کہ معشوق بے مروت اور جفا پیشہ ہوتا ہے تو اس کے در سے کسی خوشگوار یادگار یا تحفے کی امید لایعنی ہے۔ لیکن معشوق سے وابستہ ہر چیز عاشق کے لیے بے پیش قیمت ہوتی ہے، خواہ وہ پتھر ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا جب کوئی اور چیز معشوق کے شہر یعنی ''شہر ستم گر'' سے نہیں مل سکتی تو یاد کے طور پر پتھر ہی سہی۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ عاشق معشوق کے عشق میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور دیوانے کو بچے اور فرزانے پتھر مارتے ہیں۔ اس تصور کو دھیان میں رکھیں تو پتھر لے چلنے کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ گویا پتھر عاشق کے پاس معشوق کے ستم کی یادگار کے طور پر رہے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ معشوق کے شہر یا اس کے کوچے کے سارے ہی لوگ ستم ڈھانے والے ہیں، کیوں کہ عاشق پر پتھر چلانے کا ستم

خود معشوق نہیں کرتا، بلکہ اس کے شہر یا کوچے کے لوگ کرتے ہیں۔ اس طرح شہر ستم گر محض مرکب اضافی یعنی ستم گر کا شہر نہیں، بلکہ مرکب توصیفی بھی ہے یعنی ستم ڈھانے والا شہر۔ ''شہر ستم گر'' کے اس ابہام نے شعر کی معنوی جہتوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس ابہام کی وجہ سے شعر روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید حسیت سے بھی وابستہ ہو گیا ہے۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیال یار کی چادر ہی لے چلیں

اس شعر میں متکلم محبوب کی جدائی کا اظہار کر رہا ہے۔ جدائی یا فراق کے دو ممکنہ اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہی روایتی سبب کہ معشوق بے اعتنائی کرتا ہے، عاشق پر ذرا التفات نہیں کرتا۔ یہ بے مروتی عاشق پر بہت گراں گزرتی ہے اور اس کے لیے زندگی کا سفر کڑی دھوپ میں سفر کرنے کے مترادف بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے معشوق کے فراق میں عاشق کا بھری دنیا میں جی نہیں لگتا اور جب جی ہی اجیرن ہو جائے تو زندگی بھی کڑی ہو جاتی ہے، اسے گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں کڑی دھوپ کے سفر سے مراد زیست کے مصائب و آلام سے ہے۔ ایسی صورت میں عاشق کے پاس بس یہی ایک چارہ رہ جاتا ہے کہ معشوق کے خیال میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔ مبتلائے عشق کی یہ بے خبری ہی اسے زندگی کی صعوبتوں سے بیگانہ کرتی ہے۔ دھوپ کی مناسبت سے چادر کا لفظ خوب استعمال ہوا ہے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے سایے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن شعر میں سایے کا ذکر نہ کر کے چادر کا ذکر کیا گیا ہے جو سایے کا سبب ہے۔ گویا شعر میں مجاز مرسل کا حسن بھی ہے یعنی سبب کہہ کر مسبب مراد لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سر پر کسی کی چادر ہونے سے محافظت اور پناہ کا تصور بھی وابستہ ہے۔ اس پر بھی غور کیجیے کہ ''خیال یار'' ایک غیر مرئی یعنی نظر نہ آنے والی شئے ہے۔ شاعر نے اسے ایک مرئی یعنی نظر آنے والی چیز چادر سے تشبیہ دے کر ''خیال یار'' کی تجسیم کر دی۔ مناسبت، مجاز مرسل، چادر سے وابستہ تصور، غیر مرئی کی تجسیم ایسے عناصر شاعر کی فن کاری پر دال ہیں اور اس سے بیان میں حسن اور صناعی پیدا ہو گئی ہے۔

رنج سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاک کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

اس شعر کا مضمون بھی وہی ہے جو غزل کے پہلے شعر کا ہے۔ البتہ الفاظ کی تبدیلی نے معنی کا راستہ بھی کچھ بدل دیا ہے۔ یعنی معشوق جو روایتاً عاشق کی طرف التفات نہیں کرتا اور عاشق کا یہ حال ہے کہ وہ کبھی اس بہانے تو کبھی اُس بہانے معشوق کی گلی میں صبح سے شام کرتا ہے۔ گویا اسے حاصل کچھ نہیں ہوتا بس خاک اڑاتا ہے۔ ایسی صورت میں کم از کم اس کی گلی کی مٹی ہی گانٹھ (لے) لی جائے تاکہ معشوق کے کوچے کی رہ نوردی کی کچھ یادگار یا کوئی نشانی ہی پاس رہے۔ ''خاکِ کوچۂ دلبر'' کو بطور نشانی ساتھ لے چلنا عاشق کی انتہائی محبت کی دلیل ہے، لیکن اگر ہم یہ سوال قائم کریں کہ خاک ہی کیوں کچھ اور کیوں نہیں؟ تو یہ بھی معنی نکلیں گے کہ غالباً معشوق کی گلی میں سوائے خاک کچھ اور بچا ہی نہیں تھا۔ اب یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ معشوق کی گلی میں کوئی افتاد پڑی اور سب کچھ لوٹ لیا گیا یا خود معشوق نے ہی سب کچھ لٹا دیا اور جب عاشق کی باری آئی تو بس خاک ہی بچی۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ آخر نشانی لے جانا کیا ضروری ہے؟ کیا بے پناہ محبت اور جذبۂ صادق کے علاوہ بھی کوئی مقصد ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے کسی کو یا ایک سے زائد لوگوں کو بطور ثبوت دکھانا ہے؟ اس دکھانے کے پیچھے کا سبب ثبوت کے بجائے عبرت دلانا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی غور کرنے کی چیز ہے کہ اگر ''خاکِ کوچۂ دلبر'' کو بطور نشانی ساتھ لے چلنے کا سبب شدید محبت کے علاوہ بطور ثبوت اوروں کو بھی دکھانا ہے تو وہ کون لوگ ہیں جو خاک کو پہچان لیں گے کہ ہاں یہ

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شعر میں ''دل گرفتگی'' اور ''باہر لے چلنا'' کلیدی الفاظ ہیں۔ دل گرفتگی کے معنی دکھ، تکلیف یا مصیبت کے ہیں۔ جب کہ باہر لے چلنے کی بات اس رنج اور مصیبت سے نجات دلانے کی خاطر ہے۔ چھیڑتی کا لفظ استعمال کرنے سے معلوم ہوا کہ باہر لے چلنے کی بات ایک قسم کا طنز اور تمسخر ہے۔ ظاہر ہے دل گرفتگی جو گھبراہٹ کا سبب ہے، باہر بھی وہی ساتھ ہوگی یا ساتھ چلے گی تو گھبراہٹ کا کیا ازالہ ہوگا۔ گویا اندر ہوں یا باہر دل گرفتگی سے نجات نہیں۔ عاشق دل گرفتہ ہوتا ہے اور اسے کسی پہلو قرار نہیں ہوتا۔ بے چینی اور بے قراری کے سبب اس کے اندر رمیدگی اور وحشت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رمیدگی اور وحشت اسے کبھی گوشۂ تنہائی پر مجبور کرتی ہے، تو کبھی دشت نوردی پر۔ عین ممکن ہے کہ اندر ہوں یا باہر دونوں جگہ ہجوم کی یکسانیت ہے یا پھر ایک جیسی ویرانی لہٰذا اندر رہیں یا باہر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ باہر لے چلنے کی بات کو چھیڑ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

اس شعر میں ''شہرِ بے چراغ'' اور ''شبِ فراق'' کلیدی الفاظ ہیں۔ شہرِ بے چراغ یعنی اندھیرا اور تاریک شہر، ایسا شہر جہاں ظلمت ہی ظلمت ہو۔ شبِ فراق کا مطلب ہے جدائی کی رات۔ ہجر رات عاشق پر بڑی بھاری ہوتی ہے۔ وہ اسے کسی طرح گزار دینا چاہتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جیسی تاریکی گھر میں ہے ویسی ہی باہر بھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ یعنی گھر میں بھی تنہائی ہے اور باہر بھی تو باہر بھٹکنے کا کیا فائدہ۔ اس سے بہتر ہے کہ فراق کی رات گھر میں ہی کاٹ دی جائے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شبِ فراق تو ہر طرف ہے کیا گھر اور کیا باہر۔ شبِ فراق کہیں سفر نہیں کر رہی، چل نہیں رہی جو متکلم اسے گھر میں دعوت دے رہا ہے اور جس شب کا ذکر ہو رہا ہے وہ عاشق یا متکلم کے لیے ہی شبِ فراق ہے۔ لہٰذا عاشق اپنے بھٹکنے کو شبِ فراق کے بھٹکنے سے تعبیر کر رہا ہے اور خود گھر لوٹنے کو شبِ فراق کے گھر لوٹنے سے تعبیر کر رہا ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم ناصر کاظمی کی شامل نصاب دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(ب)

یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیماں کے محل میں آئے

جبر سے ایک ہوا ذائقۂ ہجر و وصال

اب کہاں سے وہ مزا صبر کے پھل میں آئے

یہ بھی آرائش ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقۂ فکر سے میدان عمل میں آئے
ہر قدم دست و گریباں ہے یہاں خیر سے شر
ہم بھی کس معرکۂ جنگ و جدل میں آئے

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے

عزیز طلبا! ابھی ہم نے مذکورہ جس غزل کو پڑھا ہے اس کی تشریح و توضیح مندرج ذیل ہے:

یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیماں کے محل میں آئے

اس شعر میں تلمیح کا حسن ہے، کیوں کہ اس میں ملکۂ سبا بلقیس اور سلیمانؑ کے مشہور واقعے کا بیان ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شعر میں جب کسی تاریخی، نیم تاریخی یا قرآنی واقعہ کا بیان ہو تو اُسے صنعتِ ''تلمیح'' کہتے ہیں۔ شعر کی تشریح یوں ہے کہ متکلم اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میری شاعری میں تیرا حسن ایسے منعکس ہوتا ہے جیسے بلقیس سلیمانؑ کے محل میں داخل ہو رہی ہو۔ حضرت سلیمانؑ کے محل میں بلقیس بڑی ہی شان و شوکت سے آئی تھی اور اس کے شایانِ شان اس کا استقبال بھی کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں قصر سلیمانؑ کا فرش شیشے کا تھا۔ ملکۂ سبا یعنی بلقیس کو اس فرش پر پانی کا گمان ہوا اور اس نے اپنے پائنچے اس قدر اوپر کر لیے کہ پنڈلیاں ظاہر ہو گئیں۔ اس تفصیل کو دھیان میں رکھا جائے تو شعر میں پیکریت کی شان کا اندازہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس شعر کے ذریعے غزل کی صناعی اور حسن کے ناز و انداز و ادا کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جبر سے ایک ہوا ذائقۂ ہجر و وصال
اب کہاں سے وہ مزا صبر کے پھل میں آئے

اس شعر کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ صبر کرنا گویا خود پر جبر کرنے کے مترادف ہے۔ عاشق ایام ہجر میں خود پر جبر کرتے ہوئے صبر کرتا ہے۔ خواہ یہ صبر وہ از خود کرتا ہو یا دوستوں، ناصحوں یا غمگساروں کی تلقین پر۔ صبر کرنا اس کی فطرت کا حصہ بن جاتا ہے اس امید پر کہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب وصال ہوگا اور عاشق کے صبر کا پھل یہی وصال ہے، جس کو شیریں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہوا کہ خود پر جبر اس کی عادت بن گئی اور اس کے لیے روز وصال بھی ہجر کے دن کی طرح گزرا۔ ایسی صورت میں ہجر اور وصال کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں رہ گیا اور صبر کے پھل کا وہ مزا جس کے بارے میں سنتے آئے تھے نہیں ملا۔ یہاں غور کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ کس کے جبر سے ہجر و وصال کا ذائقہ ایک ہو گیا۔ خود کے جبر سے یا یہ جبر کسی اور کا تھا۔ جبر معشوق کا بھی ہو سکتا ہے کہ جب وصال کا موقع آیا تو معشوق کے رعب و دبدبے کی وجہ سے یہ موقع گنوا دیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معشوق کی شرم و حیا نے معشوق کو بھی

خود پر جبر کرنے پر مجبور کر دیا ہو اور اس طرح روز وصال اور ہجر کے دن میں کوئی امتیاز نہ رہا۔

یہ بھی آرائش ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقۂ فکر سے میدان عمل میں آئے

اس شعر میں شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ زندگی حرکت و عمل کا نام ہے۔ اسی سے زندگی یا دنیا کی آرائش ہے۔ محض فکر اور باتوں سے تبدیلی نہیں آتی گویا صرف غور و فکر سے جمود پیدا ہوتا ہے۔ یہ جمود حرکت و عمل سے ٹوٹتا ہے اور تب کہیں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو کہ آرائش اور حسن کا سبب ہوتی ہے۔ آرائش کی مناسبت سے حلقے کا لفظ نہایت مناسب استعمال ہوا ہے۔ حلقۂ فکر کی ترکیب گوشہ نشینی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ہر قدم دست و گریباں ہے یہاں خیر سے شر
ہم بھی کس معرکۂ جنگ و جدل میں آئے

اس شعر میں دنیا میں خیر و شر کا جو تصادم ہے اس کو پیش کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں خیر و شر کے مابین جنگ ہمیشہ سے جاری ہے۔ خیر و شر کی اس کشمکش سے ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ دوسرے مصرعے کے انشائیے لہجے نے شعر میں ایک بات پیدا کر دی ہے۔ یہ انشائیہ لہجہ ''کس'' کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ انشائیہ لہجے نے دوسرے مصرعے کے معنوی امکانات کو وسعت دی ہے۔ یعنی متکلم معرکۂ جنگ و جدل کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہا ہے، معرکۂ جنگ و جدل پر حیران ہے، شک میں مبتلا ہے یا پھر خیر و شر کے اس معرکۂ جنگ و جدل سے پریشان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا مصرعہ کسی سے خطاب ہے۔ اس تعلق سے کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ مجموعی طور پر شعر سے دو معنی تو برآمد ہی ہو رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ متکلم کو معرکۂ جنگ و جدل میں مزا آ رہا ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ وہ مذکورہ معرکے میں آ کر پچھتا رہا ہے یا بیزار ہے۔ پچھتانے کے بھی کئی سبب ہو سکتے ہیں یا تو یہ معرکہ اس کے شایان شان نہیں ہے یا پھر وہ اس معرکے میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن چار و ناچار اسے آنا پڑا۔ یہ سارے امکانات اسی ایک لفظ ''کس'' کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے

ناصر کاظمی کی شاعری میں رفتگاں کا سراغ ڈھونڈنا بہت عام بات ہے۔ اس حوالے سے شمیم حنفی کا مضمون ''ناصر کاظمی اور ان کا یادنگر'' بہت کارآمد ہے۔ موقع نکال کر آپ کو اس مضمون کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس شعر کا تعلق بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو اور یادنگر سے ہے۔ متکلم ایسے لوگوں کو یاد کر رہا ہے جن کے بارے میں سوچ کر یا جن کا تصور ہی کر لینے سے اس کی زندگی صحیح معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق تھی۔ اب وہ لوگ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انھیں موت نے شکار کر لیا ہے۔ مضمون نیا نہیں ہے لیکن بیان کی ندرت اور کیفیت کے اسلوب نے مضمون کو تازہ کر دیا ہے۔ ''دام اجل'' میں آنے کا جواب نہیں۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہوئے کہ اجل نے ان کا شکار کر لیا اور دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اجل نے انھیں جھانسا دے کر پھانس لیا۔ آخر اجل جیسی خوفناک چیز نے انھیں کس طرح کا جھانسا دیا ہوگا یہ بھی غور کرنے کی چیز ہے۔

17.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- ناصؔر کاظمی کے سوانحی کوائف اور ان کی ادبی خدمات سے واقفیت حاصل کی۔
- ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی اور ان کے کلام کی خصوصیات کو جانا۔
- ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی کے مقام ومرتبہ کو سمجھا۔
- ناصؔر کاظمی کی شامل نصاب دو غزلوں کی قرأت سیکھی۔
- ناصؔر کاظمی کی غزلوں کی تشریحات سمجھیں۔

17.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ ناصؔر کاظمی کے سوانحی کوائف مختصراً رقم کیجیے۔

۲۔ ناصؔر کاظمی کی تصانیف کے نام اور پہلی اشاعت کا سن درج کیجیے۔

۳۔ ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں زبان اور الفاظ کے استعمال کی برجستگی پر اظہار خیال کیجیے۔

۴۔ ناصؔر کاظمی کو بچپن میں کن چیزوں کا شوق تھا؟ بیان کیجیے۔

۵۔ نصاب میں شامل ناصر کاظمی کی دوسری غزل کے پہلے شعر یعنی مطلعے کی تشریح کیجیے۔

17.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ ناصر کاظمی کا پورا نام سید ناصر رضا کاظمی تھا۔ انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی پیدائش ۸/ دسمبر ۱۹۲۵ء کو محلّہ قاضی واڑہ، انبالہ (پنجاب) میں ہوئی۔ ان کی والدہ کا نام کنیزہ محمد بیگم اور والد کا نام سید محمد سلطان کاظمی تھا۔ ناصر کی ابتدائی تعلیم (پانچویں جماعت تک) انبالہ کے 'مشن گرلز اسکول' میں ہوئی۔ انبالہ کے مسلم ہائی اسکول سے نویں اور دسویں کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے ایف اے کا امتحان پاس کیا لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے بی اے کی ڈگری مکمل نہیں کر سکے۔ جس وقت تقسیم ہند کا المیہ وجود میں آیا اس وقت ناصر کاظمی کی عمر ۲۲ برس کی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی اور صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ بعد میں ریڈیو پاکستان میں ملازمت کی اور ۲/ مارچ ۱۹۷۲ء کو ۴۶ سال کی عمر میں ناصر کاظمی کا انتقال ہوگیا۔

۲۔ ناصر کاظمی کا سب سے پہلا شعری مجموعہ ''برگ نے'' ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آیا۔ علاوہ ازیں دیوان (غزلیں، ۱۹۷۲ء)، پہلی بارش (غزلیں، ۱۹۷۵ء)، نشاط خواب (نظمیں، ۱۹۷۷ء)، سر کی چھایا (منظوم ڈراما، ۱۹۸۱ء) اور خشک چشمے کے کنارے (۱۹۸۲ء) ان کا تحریری اثاثہ ہیں۔

۳۔ ناصر کاظمی کی غزلوں میں زبان اور الفاظ کے استعمال کی برجستگی خاص طور پر متوجہ کرتی ہے۔ شعر خواہ کتنا ہی نزولی صفت معلوم ہو لیکن اس میں شعوری کوشش کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ ناصر کاظمی بھی شعر سے ''زور آزمائی'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی شعوری کوشش سے ماورا نہیں۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں کسی قسم کے تکلف یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ اس سے زبان اور اس کے استعمال پر ناصر کاظمی کی قدرت اور سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے وہ اشعار جو فارسی

تراکیب سے آمیز ہیں ان میں بھی تکلف اور تصنع کی جگہ ایسی برجستگی نظر آتی ہے جس سے فارسی تراکیب کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔

۴۔ ناصر کاظمی کو بچپن میں گھڑ سواری، شکار کرنا، ندی کے کنارے گھومنا، پہاڑوں کے نظارے کرنا، شطرنج کھیلنا، چڑیوں سے پیار کرنا، پودوں سے دلار کرنے کا شوق تھا۔

۵۔ یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیماں کے محل میں آئے

اس شعر میں تلمیح کا حسن ہے کیونکہ اس میں ملکۂ سبا بلقیس اور سلیمانؑ کے مشہور واقعے کا بیان ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شعر میں جب کسی تاریخی، نیم تاریخی یا قرآنی واقعہ کا بیان ہو تو اُسے صنعتِ ''تلمیح'' کہتے ہیں۔ متکلم اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میری شاعری میں تیرا حسن ایسے منعکس ہوتا ہے جیسے بلقیس سلیمانؑ کے محل میں داخل ہو رہی ہو۔ حضرت سلیمانؑ کے محل میں بلقیس بڑی ہی شان و شوکت سے آئی تھی۔ کہتے ہیں قصر سلیمانؑ کا فرش شیشے کا تھا۔ ملکۂ سبا کو اس فرش پر پانی کا گمان ہوا اور اس نے اپنے پائنچے اس قدر اوپر کر لیے کہ پنڈلیاں ظاہر ہو گئیں۔ اس تفصیل کو دھیان میں رکھا جائے تو شعر میں پیکریت کی شان کا اندازہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس شعر کے ذریعے غزل کی صناعی اور حسن کے ناز و انداز و ادا کی طرف اشارہ کیا ہے۔

17.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
عصمت	:	عزت
رنجش	:	لڑائی، جھگڑا
زرد	:	پیلا
کوچہ	:	گلی
دل گرفتگی	:	دکھ، ملال، اداسی
خانۂ دل	:	دل کے اندر کوئی گوشہ، اردو شاعری میں دل کو گھر، نگر، شہر بھی کہتے ہیں
شہرِ ستم گر	:	وہ شہر جہاں ستم گر رہتا ہو، وہ شہر جہاں ستم کیا جاتا ہو، معشوق کا شہر
بے چراغ	:	جہاں چراغ نہ ہو، تاریکی، ظلمت

17.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ ناصر کاظمی مشمولہ ''غزل کا نیا منظر نامہ'' : شمیم حنفی

۲۔ ناصر کاظمی اور ان کا یادنگر (فکر و تحقیق، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸) : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

۳۔ کارگاہ سخن: ناصر کاظمی (جدید شعری منظر نامہ) : حامدی کاشمیری

۴۔ ناصر کاظمی کی شاعری : حامدی کاشمیری

۵۔ وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر - ناصر کاظمی شخصیت اور فن : حسن رضوی